Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
چیئرپرسن، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
سید عبدالباسط
ایم ایس سکالر، شعبہ اصول الدین بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

"سپائرل آف سائلنس نظریے" کے تناظر میں نقش فریادی کا مطالعہ

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad
Syed Abdul Basit
MS Scholar, Department of Usuluddin International Islamic University, Islamabad

A Study Of Naqsh Faryadi In The Context Of "Spiral Of Silence Theory"

The spiral of silence theory is a political science theory proposed by the German political scientist Elisabeth Noelle-Neumann. According to the spiral of silence theory, individuals will be more confident and outward with their opinion when they notice that their personal opinion is shared throughout a group. But if the individual notices that their opinion is unpopular with the group they will be more inclined to be reserved and remain silent. During the mid-20th century, there was a series of social oppressions everywhere in the subcontinent which resulted in a terrible culture of silence, During this turbulent time Faiz Ahmad Faiz a renovated urdu poet joined The Indian progressive writer’s movement and gradually started raising his voice against social oppression, In his poetry different gradations can be observed in this regard, This article will present an in-depth analysis of these graduations under the light of upper mentioned socio-political theory.

Keywords: individual, Elisabeth, subcontinent, oppression

کلیدی الفاظ: سپائرل آف سائلنس، رائے عامہ، نیم شعاریاتی احساس، الزبتھ نویل نیومن

سپائرل آف سائلنس نظریہ (Spiral of Silence theory) سیاسیات اور سماجی مواصلات کے شعبوں میں سب سے اہم اور کلیدی نظریات میں سے ایک بنیادی نظریہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نظریہ خاموشی اختیار کرنے اور خاموشی توڑنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نظریے کو ایک جرمن سیاسی سائنسدان الزبتھ نویل نیومن (2010-1916;Elisabeth Noelle-Neumann) نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں پیش کیا تھا۔

سپائرل آف سائلنس نظریہ کے مطابق لوگ مسلسل اپنے اردگرد کے لوگوں کے نظریات سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے رویوں

اور افکار کو اکثریتی رجحانات کے مطابق ترتیب دیتے ہیں۔ کیونکہ لوگ اکثریتی رجحان کے مخالف جانے میں خوف محسوس کرتے ہیں:

The spiral of silence model assumes that people are constantly aware of the opinions of people around them and adjust their behaviors (and potentially their opinions) to majority trends under the fear of being on the losing side of a public debate.[1]

جتنا زیادہ کسی شخص کے ذاتی تاثرات رائے عامہ سے مماثلت رکھتے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ یہ شخص اس رائے کو کھلے عام عوام میں ظاہر کرنے پر آمادہ ہو گا لیکن اگر یہ شخص سمجھتا ہے کہ اکثریتی رجحان اس شخص کے نظریات سے متصادم ہے تو وہ اپنے نظریات کو ظاہر کرنے کے متعلق ہچکچاہٹ کا شکار ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کے ذاتی افکار اور رائے عامہ کے درمیان تفاوت جتنا زیادہ ہو گا اتنا ہی زیادہ امکان ہے کہ یہ شخص اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرے گا اور خاموش رہے گا کیونکہ جتنا یہ تفاوت بڑھتا رہے گا اتنا یہ شخص سماج کے امتیازی برتاؤ کے ڈر کا شکار ہوتا رہے گا۔

The phrase "spiral of silence" actually refers to how people tend to remain silent when they feel that their views are in the minority.[2]

خاموشی کے سپائرل کا مطلب یہ ہے کہ منفرد نظریات رکھنے والے لوگوں کے گرد خاموشی کا ایک گردش کرتا ہوا سپائرل بنتا ہے، جتنا زیادہ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کے خیالات منفرد اور اقلیت میں ہیں اتنا ہی زیادہ ان کے گرد خاموشی کا سپائرل مضبوط ہوتا جاتا ہے اور وہ اپنے نظریات کے اظہار کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔

سپائرل آف سائلنس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ منفرد نظریات رکھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سماجی طور پر امتیازی سلوک کا ایک ڈر ہوتا ہے اور یوں سماج کے اس امتیازی برتاؤ کے ڈر کی وجہ سے وہ اپنے منفرد نظریات کا اظہار نہیں کرتے اور اظہار کے بجائے یہ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ رائے عامہ کی مروجہ حالت، سماجی تنہائی اور سماج سے علیحدگی کا خوف اور اپنے منفرد نظریات کا کھل کر اظہار نہ کرنا، یہ تین رجحانات اس نظریے کے اساسی تصورات ہیں، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

The model is based on three premises: 1) people have a "quasi-statistical organ," a sixth-sense if you will, which allows them to know the prevailing public opinion, even without access to polls, 2) people have a fear of isolation and know what behaviors will increase their likelihood of being socially isolated, and 3) people are reticent to express their minority views, primarily out of fear of being isolated.[3]

اس اقتباس سے مراد یہ ہے:

الف) لوگوں کے پاس چھٹی حس کے طور پر ایک "نیم شماریاتی احساس" ہوتا ہے، جو انہیں رائے شماری کے بغیر بھی رائے عامہ کی مروجہ حالت کو جاننے اور سمجھنے کی اجازت دیتا ہے۔

ب) لوگوں کو تنہائی کا خوف ہے اور وہ جانتے ہیں کہ کونسے طرز عمل سے ان کے سماجی طور پر الگ تھلگ رہنے کے امکانات بڑھ جائیں گے،

ج) لوگ سماج کی طرف سے امتیازی سلوک اور سماجی علیحدگی (Social Isolation) کی وجہ سے اپنے منفرد خیالات کے اظہار سے کتراتے ہیں۔

چونکہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے وہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کرے گا چاہے معاشرت ہو، سماجی مواصلات کے شعبے ہوں، اسی طرح سیاست ہو یا پھر سیاست کے ضمنی مباحث، یہ تمام تر شعبے ادب کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کیونکہ جہاں ادب کی روشنی میں ان تمام شعبہ ہائے علوم کی توضیح ممکن ہے وہاں ان میں سے ہر ایک کی روشنی میں ادب کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سپائرل آف سائلنس نظریے کا تعلق ہے تو یہ نظریہ اگرچہ بنیادی طور پر صحافت اور سوشیولوجی سے تعلق رکھتا ہے لیکن ادب میں اس نظریے کو یوں لاگو کیا جاسکتا ہے کہ منفرد نظریات رکھنے والا ادیب معاشرتی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سماج کے برتاو کے مطابق اپنے نظریات کے اظہار پر آمادہ ہوتا ہے۔

ایک ادیب یا شاعر سماج کی طرف سے امتیازی برتاؤ کے خوف سے اپنے نظریات کے متعلق خاموشی اختیار کرے گا یا بصورت دیگر مخصوص حالات میں ان نظریات کا اظہار کرے گا مثلاً جب اس کے ہم فکر ادیب اور لوگ زیادہ ہوں یا ایک نمایاں صورت یہ بھی ہے کہ اس کے ہم خیال لوگ تھوڑے ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ ادیب یا شاعر اپنے سماجی شعور کی پختگی کی وجہ سے بھی اپنے منفرد خیالات کا اظہار بلا خوف کرے گا یعنی اگر اس کے ہم خیال لوگ اکثریت میں نہیں ہیں لیکن شاعر یا ادیب یہ سمجھتا ہے کہ ان منفرد نظریات سے عوامی احساسات کو آواز ملتی ہے اور ان کی قبولیت عوام میں موجود ہے لیکن سماجی خوف کی وجہ سے ان کے اظہار پر قدغنیں ہیں، تو وہ اپنے سماجی شعور کی پختگی اور اپنے نظریات کی صداقت کے باعث ان کا اظہار بلا خوف کرے گا چاہے اس اظہار کے تلخ نتائج کا سامنا ہی کیوں نہ ہو۔ اردو شعر و ادب کی روایت میں اظہار اور خاموشی کی درج بالا صورتیں موجود رہی ہیں، غزل خاموشی کی فضا میں بالعموم شگاف کرتی آرہتی ہے۔ اسی لیے بالخصوص نوآبادیاتی عہد میں بھی شعر و ادب نے سماجی جبر اور سماجی خاموشی کے خلاف نمایاں کردار ادا کیا۔

فیض احمد فیض کی شاعری کو اگر آف سائلنس نظریے کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کے باعث اظہار کے نئے راستے بنائے ہیں اور ان کی ابتدائی شاعری میں سماج کے متعلق مخصوص نظریات پر خاموشی اختیار کرنے سے لے کر آواز اٹھانے تک کے تدریجی مدارج کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

فیض بالکل عنفوان شباب میں ہی تھے جب دنیا ایک بڑی جنگ کے شعلوں سے گزر کر ایک نئے جنگی جنون کے پھٹتے ہوئے آتش فشاں کی منتظر تھی اس دور میں زندگی کے تجربات تلخ تھے اور سماج میں ہر طرف جبر ہی جبر تھا۔ اس ہنگامہ خیز دورانیہ میں جہاں ایک طرف محنت کش طبقے کا استحصال جاری تھا اور غریب فاقہ کشی کی حالت میں دو وقت کی روٹی کے لیئے ترستا تھا تو دوسری طرف ادب محض امیروں کو مسرت کا سامان بہم رکھنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور ادب کا سماجی مسائل سے کوئی سروکار ہی نہیں مانا جاتا۔ سماج میں مظلوم طبقے کے استحصال اور جاگیرداروں کے بدترین مظالم کی طرف اگر کوئی ادیب التفات کرنا بھی چاہتا تو وہ سماج کے امتیازی برتاؤ، جبر اور سماجی طور پر علیحدگی کے خوف (Fear of the social isolation) کی وجہ سے صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت نہ رکھتا۔ ان حالات میں

چند ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں پر مشتمل ایک جماعت نے ادب کو سماج کے ساتھ جوڑنا چاہا اور اسی طرح انہوں نے ترقی پسند تحریک کی داغ بیل لگا کر ادب کو مزدور اور محنت کش طبقے کا ترجمان بنا کر سماج میں رائج خاموشی کے کلچر کو توڑنے اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کی بنیاد رکھی۔

ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد فرسودہ سماج کے خلاف خاموشی کی زنجیروں کو توڑ کر آواز اٹھانا تھا لیکن جس وقت فیض نقش فریادی لکھ رہے تھے تو قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ترقی پسند شعرا اور ادبا صرف اپنے ہی حلقہ احباب تک محدود تھے اور کھل کر اپنے منفرد نظریات کا اظہار نہیں کرپاتے۔

جب فیض ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے تو ترقی پسندوں کے زیر اثر ان کے سماجی شعور میں پختگی آگئی اور ان کے رجحانات بدل گئے اور یوں رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی شاعری میں سماجی جبر کے خلاف خاموشی کے مروجہ تسلسل کو مختلف تدریجی مدارج کے ذریعے توڑ ڈالا۔

فیض کو ترقی پسند تحریک سے پہلا مسابقہ اس وقت پڑا جب فیض تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سیالکوٹ سے لاہور آئے، اس مسابقے کے حوالے سے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

وقت گزرا تو فیض اعلی تعلیم کے لیے لاہور آئے۔ یہاں کا ماحول سیالکوٹ سے خاصا مختلف تھا، کالج کے دنوں میں ہاسٹل کے کمرے میں ان کے ایک دوست خورشید انور-جو کامریڈ تھے-خفیہ باغی قسم کا لٹریچر رکھتے تھے، جسے فیض بڑے شوق سے بڑھتے تھے۔[4]

یوں یہ کمیونسٹ تحریک کے ساتھ فیض کا پہلا واسطہ تھا، اس تحریک کے ساتھ ان کا دوسرا مسابقہ تب پڑا جب تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں امرتسر کے ایک کالج میں ملازمت ملی اور کالج کے وائس پرنسپل صاحبزادہ محمود الظفر نے انہیں کیمونسٹ مینی فیسٹو دے دیا، فیض کے منفرد سماجی شعور کو جلا ملنے میں اس مینی فیسٹو کا کافی عمل دخل تھا، بہر حال یہ فیض کا کیمونسٹ تحریک سے دوسرا مسابقہ تھا۔ اس حوالے سے فیض خود لکھتے ہیں:

انیس سو پینتیس میں جب میں نے امر تسر کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں انہی مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیق کار صاحبزادہ محمود الظفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا لو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو، لیکن غیر قانونی کتاب ہے اس لئے ذرا احتیاط سے رکھنا، یہ کتاب تھی کیمونسٹ مینی فیسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی بلکہ دو تین بار پڑھی۔۔۔۔۔۔۔یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔[5]

اگر سپائرل آف سائلنس نظریے، فیض احمد فیض کے ذہنی رجحان اور ترقی پسند تحریک کے لائحہ عمل کو باھم مرتبط کر لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس پر آشوب دور میں ترقی پسند تحریک کے داغ بیل لگانے والے اگرچہ فرسودہ سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے لیکن وہ بھی معاشرتی جبر کی وجہ سے خاموشی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مصروف عمل تھے اور آزادانہ طور پر اپنے نظریات کا پرچار نہیں کر سکتے تھے۔ فیض کے کیمونسٹ تحریک سے مسابقے کے دونوں حوالوں میں بالترتیب "خفیہ باغی قسم کا لٹریچر" اور "غیر قانونی کتاب ہے اس لئے ذرا احتیاط سے رکھنا" سے اندازہ ہوتا ہے کہ منفرد نظریات رکھنے والے ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد سماجی امتیاز اور سماجی تنہائی کے خوف کی وجہ سے صرف اپنے ہی حلقہ احباب میں اپنے نظریات کا پرچار کرتے تھے اور وہ اس ابتدائی دور میں کھل کر اپنے نظریات کے اظہار پر آمادہ نہیں تھے اور یہی سپائرل آف سائلنس کا نظریہ بھی بتاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق اکثریت کے مقابلے میں منفرد سوچ رکھنے والے لوگ اپنی رائے کا اظہار کھل کر نہیں کریں گے۔ بالفاظ دیگر منفرد / مخصوص سوچ رکھنے والے افراد سماجی امتیاز اور تنہارہ جانے کے خوف (Fear of social isolation) کی وجہ سے کسی خاص موضوع یا واقعے پر اپنی رائے دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دیں گے۔

الزبتھ کو اس نظریے کا اساسی تصور جرمنی میں نازی حکومت کے دوران دوسری جنگ عظیم کے متعلق یہودیوں کی خاموشی سے ملا کیونکہ یہودی اگرچہ اس بڑی اور ہولناک جنگ کے حق میں نہیں تھے لیکن انہوں نے اقلیت میں ہونے کے باعث جنگ کی تباہ کاری پر رد عمل نہیں دیا۔

اس نظریے کے وسیع تر بیانئے کو ترقی پسند تحریک کی ابتدائی صورتحال پر اس طرح لاگو کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح جرمنی کے یہودیوں نے نازی حکومت کے دوران حکومتی جبر اور نامساعد حالات کی وجہ سے جنگ عظیم کے حق میں نہ ہونے کے باوجود اس کے متعلق خاموشی کا رویہ اختیار کیا، بالکل اسی طرح ہندوستان میں بھی کیمونسٹ تحریک سے متاثر ابتدائی دور کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے منفرد ترقی پسند نظریات اور ان نظریات پر مشتمل لٹریچر کو صرف اپنے ہی حلقہ احباب تک محدود رکھا اور معاشرے کے نامساعد حالات اور سماجی جبر کی وجہ سے وہ اس کے کھل کر اظہار کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ گویا اس وقت برصغیر میں خاموشی کا ایک تسلسل رائج تھا جس میں مجبوراً انہیں زندگی گزارنی تھی۔ جب لوگوں کو خاموش رہنے پر مجبور کیا جائے اور نتیجتاً لوگ بھی بے بسی کی خاموشی اختیار کر جائیں تو اس صورت حال کو خاموشی کا کلچر (Culture of silence) کہتے ہیں۔ گویا ترقی پسند ادیبوں کے ارد گرد خاموشی کا ایک کلچر تھا اور وہ خاموشی کے اس کلچر میں آزادانہ طور پر رہنے اور اپنے منفرد نظریات کا کھل کر اظہار کرنے سے محروم تھے۔ فیرارے خاموشی کے اس کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

...in the culture of silence the masses are mute... They are prohibited from taking part in the transformations of their society and therefore prohibited from being.[6]

جب فیض ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے تو ان کے سیاسی شعور میں پختگی آنے لگی اور رفتہ رفتہ انہوں نے خاموشی کے کلچر کو توڑنا شروع کیا۔ جس سے ان کا منفرد لہجہ نہ صرف ظلم کے خلاف جدوجہد کا نعرہ بن گیا بلکہ حق پسندی اور انسان دوستی کی راہ پر چلنے کا ایک پر امید استعارہ بھی بن گیا۔

سپائرل آف سائلنس نظریے کے بنیادی مفروضوں میں ایک مفروضہ یہ ہے کہ منفرد نظریات رکھنے والا فرد صرف اس وقت اپنے نظریات کا اظہار کرے گا جب اسے اپنا نقطہ نظر اور نظریہ غلبہ پاتے ہوئے اور عروج حاصل کرتے ہوئے نظر آئے جیسا کہ ڈیاٹرم شیوفیل اور پیٹریشیا موئے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں Willingness to Speak Out and Tendency to Remain Silent (بات کرنے کی خواہش اور خاموش رہنے کا رجحان) لکھتے ہیں:

Individuals tend to publicly express their opinions and attitudes when they perceive their view to be dominant or on the rise. In contrast, when people sense their view is in the minority or on the decline, they become cautious and silent.[7]

شیوفیل اور موئے کے وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ منفرد نظریات کے اظہار اور ان پر بات کرنے کی خواہش تب ہوتی ہے جب لوگ اپنے نقطہ نظر کو غالب یا عروج پر محسوس کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے نظریات اقلیت میں ہیں یا زوال کا شکار ہیں، تو وہ محتاط اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک فیض کی شاعری کا تعلق ہے تو یہاں صورتحال ایسی نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے منفرد نظریات کا اظہار عروج (Dominancy) میں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ذہنی شعور کی پختگی (Maturity of Mental Consciousness) کی وجہ سے کر رہے تھے۔

نقش فریادی کے دوسرے حصے میں مختلف نظموں کے بغور مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں شاعر معاشرتی زندگی کی نت نئی حقیقتوں کا سامنا کرتے ہیں تو ان کے سماجی شعور میں گہرائی اور پختگی پیدا ہوتی جا رہی ہے اور یوں رفتہ رفتہ وہ خاموشی کے سپائرل کو توڑتے جاتے ہیں۔

خاموشی کے مروجہ کلچر کو توڑنے کے تناظر میں فیض کے ہاں ذہنی اور احساساتی طور پر تدریجی ارتقا کے مختلف مدارج کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ان تدریجی مدارج کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

بعض اوقات وہ سماجی جبر پر خاموش رہ کر سب کچھ برداشت کرتے ہوئے خاموشی کے کلچر میں خاموش ہی نظر آتے ہیں مثلاً نظم "چند روز اور میری جان" میں یہی صورتحال ہے۔

اگرچہ اس نظم میں دو قسم کے رویے باہم مساوی تسلسل کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان اشعار میں جہاں صورتحال کی کربناک کیفیت نے شکست و یاس کو نسبتاً زیادہ مسلط کر دیا ہے کیونکہ شاعر کو خاموش کرایا گیا ہے وہاں ان اشعار میں شکست خوردہ احساسات امید کی لو سے دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ انہی احساسات کی وجہ سے فیض نے پورے جہان کے غم کو اپنا غم تصوّر کر کے سماجی حقائق کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے اور پوری دنیا میں جو اقوام بالا دست سماج کے ساتھ مقابلے میں بر سر پیکار تھے انہیں نئی امید کا درس دے کر تسلی دلانے لگے کہ تمہارے اوپر جو ظلم ہو رہا ہے اس کا وقت بہت کم ہے

نظم چند روز اور میری جان ملاحظہ ہو:

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اک ذرا اور ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں[8]

اس نظم میں فیض کہتے ہیں کہ ہم چند ہی روز ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہمارے آباؤ اجداد سے یہ تسلسل چلا آ رہا ہے کہ ہم ستم سہہ رہے ہیں۔ جسم، جذبات، افکار اور گفتار سب محبوس ہیں اور ان سخت حالات میں جینا تو ہماری اپنی ہمت ہے۔ انہوں نے زندگی کو مفلس کی قبا قرار دیا ہے جس میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں لیکن پھر کہتے ہیں کہ ایسا زیادہ دیر تک نہیں ہو گا، بس تھوڑا صبر کرنا چاہیے کیونکہ ظلم کی معیاد اور فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ شاعر کا خاموشی کے کلچر میں جبر کو برداشت کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا گویا اس کے گرد خاموشی کے سپائرل کی کمزوری کی گتھی ہے جسے بتدریج شاعر نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔

بعض اوقات شاعر خاموش رہتے ہیں لیکن ان کی خاموشی بھی مزاحمت پر مشتمل ہوتی ہے۔

اصل میں فیض حیات انسانی کے پیچیدہ روابط پر گہری نظر ڈال کر اپنی فکر و آگہی کو اس انداز سے ترتیب دے چکے تھے کہ خود ان کے جذبات سماج کے تمام دردمند اور شکستہ تن افراد کے احساسات بن گئے اور سماج کے مصائب ان کے ذاتی مسائل نظر آنے لگے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی جبر اور تشدد ہوا فیض اپنے پوری استعداد کے ساتھ اس کے خلاف لکھتے رہے۔ اس ضمن میں اگر وہ خاموش بھی رہے تو مزاحمت اور رد عمل پر مشتمل ان کی یہ خاموشی بھی Culture of silence کو توڑنے کے تدریجی مدارج میں سے ایک اہم درجہ ہے کیونکہ یہی مزاحمتی خاموشی رفتہ رفتہ آواز اور پھر للکار میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ فیض کہتے ہیں:

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت

شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ

اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے[9]

فیض نے جتنے گہرے شعور کے ساتھ خاموشی کو مصیبت زدہ انسانوں کے کرب کے اظہار کا ذریعہ بنا کر مزاحمت اور ردعمل کے استعارے کے طور پر پیش کیا ایسے بہت کم شعراہوں گے جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔

ان قطعات میں فیض معاشی اور معاشرتی استحصال کے تذکرے کے بعد کہتے ہیں کہ وہ خاموش رہنا چاہتے ہوئے بھی خاموش نہیں رہ سکتے کیونکہ ان کے سینے میں مزاحمت کے جذبات امڈ آتے ہیں اور پھر انہیں اپنے دل پر قابو نہیں رہتا۔ یہ قطعات اس تذبذب میں ختم ہو جاتے ہیں کہ بازار میں مزدور کے گوشت بکنے اور شاہراہوں پر غریبوں کے لہو بہنے سے ردعمل اور مزاحمت کی ایک آگ جو رہ رہ کر ان کے دل میں ابلتی ہے، تو کیا انہوں نے اس آگ کو اپنے دل کے اندر رہنے دیا یا اس کا اظہار بھی کیا۔ تو اگلے مراحل سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مزاحمت کی آگ کو اپنے دل کے اندر رہنے نہیں دیا بلکہ اپنے دل کے جذبات کا اظہار کیا اور یہ اظہار کبھی علامتی انداز میں کیا تو کبھی صراحت کے ساتھ۔

علامتی انداز کے ذریعے بھی انہوں نے لوگوں میں شعور پیدا کرنے اور انہیں جگانے کی کوشش کی ہے تاکہ لوگ خاموشی توڑ کر آواز اٹھائیں اور بالادست سماج کے جبر سے خود کو آزاد کرنے کے قابل بن جائیں۔

اس سلسلے میں فیض کا نظم "کتے" ملاحظہ ہو:

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے

کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

زمانے کی پھٹکار سرمایہ اُن کا

جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے

غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے

جو بگڑیں تو ایک دوسرے سے لڑا دو

ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو

ہر ایک کی ٹھوکر کھانے والے

یہ فاقوں سے اکتا کر مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے

تو انسان سب سرکشی بھول جائے[10]

اس نظم میں فیض کتوں کو سماجی طبقے کے لئے بطور علامت استعمال کرتے ہیں اور گلیوں میں آوارہ پھرنے والے کتوں کے ساتھ پیش آنے والے سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دوسروں کے ٹکڑوں پر قناعت کرنے والے ان آوارہ پھرنے والے بے کار کتوں کو لوگ دھتکارتے رہتے ہیں۔ ان کی رہائش کا کوئی پتہ نہیں، ان کے نصیب میں تو نہ رات کا آرام ہے اور نہ صبح کا سکون، یہ غریب کہیں سڑکوں پر لیٹ بیٹھ کر اپنی تمام زندگی گزارتے ہیں، لوگ ان کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے عوض آپس میں لڑا دیتے ہیں۔

اس نظم کے متعلق ڈاکٹر عزیزہ بانو کہتی ہیں:

اس نظم میں فیض نے آزادی سے قبل سماجی معاشرے کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے. آزادی سے پہلے معاشرے کے لوگوں کو اپنے اندر کی چھپی ہوئی طاقت کا احساس نہیں تھا۔ فیض نے اس نظم میں سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑ کر جگایا ہے۔ ان کو ان کی طاقت کا احساس دلایا ہے۔ لوگوں کو بیدار کرنے کا انداز للکار کا نہیں بلکہ علامتی ہے۔ فیض نے غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی قوم میں غلامی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا ہے حکومت کے ظلم وستم کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔[11]

فیض کتوں کی بات کرتے ہیں لیکن اس کا مقصد مظلوم عوام کو احساس دلانا ہے اور ان کے اندر بیداری کی لہر پیدا کرنا ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ یہ مظلوم انسان جو ہمیشہ ظلم و جبر اور تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں اگر یہ لوگ ان سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھائیں تو ظالم طبقے کے لوگ اپنی ساری سرکشی بھول جائیں گے، فیض کہتے ہیں کہ اگر یہ مظلوم طبقہ متحد ہو جائے اور سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھائے تو سرمایہ دار ان مظلوم لوگوں کو ان کا حق دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مظلوم اور مجبور لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیض کہتے ہیں کہ:

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے[12]

گویا فیض ان غریبوں مظلوموں اور بے کسوں کو ان کے ساتھ ہونے والے ظلموں کا احساس دلانا چاہتے ہیں، اگر ان کے دلوں میں حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ بیدار ہو گیا تو یہ لوگ اپنی حکومت بھی قائم کرسکتے ہیں۔ گویا فیض انہیں علامتی انداز میں سماج میں رائج خاموشی کی فضا[13](Culture of social silencing) کو توڑنے کا درس دے رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ فیض علامتی انداز سے ترقی کر کے سماجی جبر کے خلاف بڑی توانائی پر مشتمل بظاہر کمزور سامزاحمتی لہجہ اختیار کرلیتے ہیں اور تلاطم خیز موجوں پر مشتمل اپنی خاموشی کو توڑنے کے لئے کوئی ممکنہ درمان تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں اپنے خیالات کے اظہار میں دشواریاں بھی محسوس کرتے ہیں اور اپنے خیالات کے اظہار کے بعد نتیجے کے طور پر ممکنہ خطرات کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ فیض بڑے دھیمے لہجے میں اس صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اک کڑوا درد جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت وزنداں کی ہوس، چاک گریباں کی تلاش[14]

فیض صاحب اس کڑوے درد کو جو بقول ان کے گیت میں بھی نہیں ڈھلتا اور دل کے تاریک شگافوں سے بھی نہیں نکلتا؛ دل سے نکال کر زبان پر لا چکے تھے اور گیت میں ڈھال چکے تھے اور یوں خاموشی سے بھری فضا میں کچھ اس انداز سے بولنے لگے تھے کہ ان کی آواز کو دبانا مشکل ہو گیا اور صرف اپنے وطن میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں سیاسی اور سماجی جبر کے خلاف فیض صاحب ایک مستعد آواز بن گئے۔ فیض سماجی جبر پر رد عمل کے ضمن میں رفتہ رفتہ دھیمے اظہار سے ترقی کر کے ظلم کے خلاف صراحتاً آواز اٹھانے اور مظلوموں کو خاموشی توڑنے کا درس دینے کیلئے للکار پر اتر آتے ہیں۔

اس سلسلے میں نظم بول ملاحظہ ہو:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکاں میں
تند ہے شعل، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے

جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے[15]

فیض احمد فیض اس نظم میں عوام کو قدامت پسندی کی مہلک گرفت سے نکلنے اور سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھانے کا درس دے رہے ہیں اور انہیں اپنے حقوق کی پامالی پر مزید خاموش نہ رہنے پر ابھار رہے ہیں۔ اس دور کی ہندوستانی شاعری کی خصوصیت رہی تھی کہ وہ زندگی کے بیّن اور حقیقی کیفیتوں اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع نہیں بناتی تھی لیکن فیض احمد فیض نے شاعری کو عوام کے سکھ دکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائی کہ جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں تھی۔ اور یہی انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے ۱۹۳۶ء کے اعلان نامے میں بھی منظور ہوا تھا۔[16]

زیر بحث نظم میں شاعر لوگوں کو سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھانے کا درس دے رہے ہیں اور انہیں اپنے حقوق کی پامالی پر مزید خاموش نہ رہنے پر ابھار رہے ہیں۔

فیض احمد فیض نے اپنے دل کی حسرتوں کو آواز میں بدلنے اور دوسروں کو بھی ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے اور خاموشی توڑنے کی تلقین کی۔ گویا انہوں نے اپنے حصے کا کام کر دیا اور حالات کی تندی سے ڈرے بغیر لوگوں کو Culture of silence توڑنے کی دعوت دے دی۔ بقول فیض:

فیض ہوتا رہے جو ہونا ہے

شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے[17]

اب فیض کی آواز بھی اکیلے فیض کی آواز نہیں رہی بلکہ تمام مظلوم انسانوں نے بھی فیض کی آواز پر لبیک کہا اور خاموشیاں توڑنے لگے۔ جیسا کہ فیض دست صبا میں کہتے ہیں:

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے[18]

رفتہ رفتہ خاموشی کے کلچر کو توڑ کر شاعر کے شعور میں اس حد تک پختگی آجاتی ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے ظالم سے جنگ پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نظم سوچ کے آخر میں شاعر کہتے ہیں:

بے فکرے دھن دولت والے

یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں

ان کا سکھ آپس میں بانٹیں

یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے

سر پھوٹیں گے خون بہے گا

خون میں غم بھی بہہ جائیں گے

ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا[19]

اس نظم کی ابتدا متذبذب خاموشی سے ہوتی ہے جبکہ اس کا اختتام دلیرانہ للکار اور جنگ کی جستجو پر ہوتا ہے۔ نظم کی ابتدائی سطروں معلوم ہوتا ہے کہ سماجی جبر کے رد عمل میں فیض بھی باقی دنیا کی طرح متذبذب خاموشی اختیار کر چکے ہیں، اگرچہ یہ خاموشی بھی مظلوم طبقے کے استحصال کے رد عمل میں مزاحمت کی خاموشی ہے لیکن نظم کو آگے لے جاتے ہوئے فیض مزاحمتی خاموشی کو بتدریج انقلابی آواز میں تبدیل کرتے دکھائی دیتے ہیں اور نظم کے آخر میں ان کی آواز اتنی گونج دار بن جاتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں بلکہ مرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

زیر بحث نظم "سوچ" ایک سوال سے شروع ہوتی ہے کہ شاعر کا دل کیوں خوش نہیں ہے اور وہ کیوں خاموش رہتا ہے گویا فیض احمد فیض خود بھی اپنی خاموشی کے متعلق تذبذب کا شکار ہیں۔ لیکن پھر شاعر کہتا ہے کہ میری بات کو چھوڑو میں جس حالت میں بھی ہوں اچھا ہوں اگر میرا دل غمگین ہے تو کیا ہوا یہ ساری کائنات بھی تو غمگین ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب میرا بھی ہو جائے تو پھر بھی دنیا کے غم دل میں رینگتے لوگ جو پاپ کے پھندوں اور ظلم کے بندھن میں ایک ساتھ جکڑے ہوئے ہیں، صرف ہمارے کہنے سے ان کا یہ بندھن کٹ نہیں سکتے گویا پاپ کے پھندے اور ظلم کے بندھن میں جکڑے مظلوم لوگ سماجی خاموشی کے کھٹن مراحل سے گزرتے ہیں۔

فیض جو دنیا کے غموں پر متذبذب مزاحمتی خاموشی اختیار کر چکے تھے وہ دنیا کے غموں کو اپنے ہی غم قرار دے کرCulture of social silencing کو پائمال کرنا شروع کرتے ہیں کہ غم ہر حالت میں مہلک ہے، چاہے اپنا ہو یا کسی اور کا ہو تو کیوں نہ پہلے پورے جہاں کا غم اپنا لیں پھر بعد میں باقی تدبیریں سوچیں، اور پھر فیض پورے جہان کا غم اپنا کر اپنی متذبذب خاموشی کو توڑ دیتے ہیں اور سماج کے جابر سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ شاعر کے دل میں امیروں اور سرمایہ داروں کی خوشی کانٹے کی مانند چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ امیر اور سرمایہ داروں کی خوشی سارے عالم انسانیت میں بانٹ دے۔ جس خوشی سے امیر لطف اندوز ہو رہے ہیں، شاعر یہی خوشی ان نادار لوگوں کو بھی دینا چاہتے ہیں جو اس خوشی سے اب تک محروم رہے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو نظم "سوچ" میں اول سے آخر تک خاموشی سے لے کر آواز اٹھانے اور لڑنے پر اتر آنے تک کے تدریجی ارتقا کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ "نقش فریادی" کی تمام شاعری میں جو تدریجی ارتقا نظر آتا ہے یہ نظم اس ارتقا کی نمائندہ نظم ہے۔

اسی سے ملتا جلتا رجحان نقش فریادی کے دوسرے حصے کی ہی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" میں بھی ملتا ہے، نظم کی ابتدا رومانوی انداز میں ہوتی ہے اور نظم کی ابتدا میں گردو پیش کے استحصالی فضا پر مکمل خاموش دکھائی دیتی ہے لیکن جلد ہی نظم انقلاب کی طرف رخ موڑ لیتی ہے اور شاعر اسے مظلوم اور بے آواز طبقے کی آواز بنا دیتا ہیں۔

اس نظم کے پیش منظر میں فیض خود کہتے ہیں:

۔۔۔ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔[20]

اس نظم کی مجموعی صورتحال سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیض پہلے رومانوی جذبات کا اظہار کرتے ہیں پھر معاشرتی ناہمواریوں اور سماجی جبر کا نقشہ کھینچتے ہیں اور نظم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ہم ان کی شاعری میں ذہنی اور احساساتی طور پر تدریجی ارتقاء کا مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ وہ کس طرح سماجی امتیاز (Social discrimination) کے خلاف آواز اٹھانے اور سماجی جبر پر نظر ڈالنے کی خواہش کرتے ہیں.

اس تفصیلی بحث سے سپائرل آف سائلنس نظریے کے تناظر میں جبراً اختیار کردہ خاموشی سے لے کر خاموشی توڑنے تک کے مندرجہ ذیل تدریجی مدارج اور مراحل سامنے آتے ہیں:

- بعض اوقات فیض سماجی جبر پر خاموش رہ کر سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔
- کبھی کبھی فیض سماجی جبر پر مزاحمتی خاموشی اختیار کرتے ہیں۔
- کبھی علامتی انداز کے ذریعے خاموشی کے مروجہ کلچر کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- بعض اوقات سماجی جبر کے خلاف بڑی توانائی اور سماجی شعور پر مشتمل لیکن بظاہر کمزور سا مزاحمتی لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔
- اسی طرح کبھی کبھی کسی نظم کی ابتدا رومانوی انداز میں کرتے ہیں اور نظم کے یا بتدا میں گردو پیش کے استحصالی فضا پر مکمل خاموش دکھائی دیتے ہیں لیکن جلد ہی نظم کو انقلاب کی طرف موڑ لیتے ہیں اور اسے مظلوم اور بے آواز طبقے کی پر اثر آواز بنا دیتے ہیں۔
- اسی طرح کبھی کبھی نظم کی ابتدا متذبذب خاموشی سے کرتے ہیں جبکہ اس کا اختتام دلیرانہ للکار پر کرتے ہیں۔
- بعض اوقات جبر کے رد عمل میں پر جوش اظہار کرتے ہیں اور کبھی اظہار سے للکار کی طرف جاتے ہیں، حتیٰ کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔
- اخر میں دوسروں کو بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور خاموشی توڑنے پر ابھار رہے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو ان تمام تدریجی مدارج میں رومان اور انقلاب کا یکساں اور رواں تسلسل پایا جاتا ہے کیونکہ شاعر اگرچہ حسینہ خیال کے اداؤں پر فریفتہ ہے لیکن دنیا کے مظلوموں کی حالت زار سے بھی آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ حسن کی نزاکتوں اور محبوب کے جور و عتاب کے ساتھ ساتھ اردگرد کے حالات بھی انہیں ستانے لگتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی صورت میں شعوری طور پر اردگرد کے حالات پر بھی زبان کھول لیتے ہیں۔ اس ضمن میں فیض کی شاعری میں استعارہ سازی پر تحقیق کرنے والے عرفان الحسن کہتے ہیں:

فیض طبعاً حسن پرست اور رومان پسند ہیں لیکن وہ شعوری طور پر دنیا کی حقیقتوں کا ترجمان بننا چاہتا ہے اس کشمکش کی وجہ سے ان کے ہاں رومان اور انقلاب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔[21]

رومان اور انقلاب دونوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے خاموش کئے گئے عوام کی امنگوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زبان کے رکھ رکھاؤ اور فنی نزاکتوں کا دامن بھی نہیں چھوڑا اور حقیقت پسندی اور انقلابی آھنگ کے برتاؤ کی کوشش میں ادبیت سے دور نہیں بھاگے۔

یہاں ایک اور بات بھی بہت اہم ہے کہ فیض سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے مختلف ذہنی اور احساساتی مدارج میں ادب کی جمالیاتی قدروں سے منہ نہیں موڑتے، یہی وجہ ہے کہ ان تمام تدریجی مدارج میں ادب کی جمالیاتی قدروں کا ادراک اور فن کی جمالیاتی ساخت کا شدید احساس بدرجہ اتم موجود رہتا ہے۔ رومان اور انقلاب کے امتزاج کے ممکنہ نتیجے کے طور پر سماجی استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بعض اوقات ان کا مزاحمتی لہجہ بھی انتہائی نرم معلوم ہوتا ہے۔ اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی لندن کی شعبہ تاریخ کے سابق استاد محمد ضیاء الدین احمد شکیب یہ رائے دیتے ہیں کہ:

فیض کی شاعری کے سارے ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا مزاحمتی لہجہ نہایت نرم ہے یا دوسرے الفاظ میں بظاہر کمزور تاہم اگر فیض کی شاعری کو ان کی شخصیت اور زمانے میں ضم کر کے دیکھا جائے تو ان کے اس دھیمے مزاحمتی لہجے میں بڑی توانائی مضمر ہے۔[22]

جیسا کہ اوپر اجمالی طور پر تذکرہ کیا گیا کہ رومان اور حقیقت کے امتزاج اور نرم مزاحمتی لہجے کے ساتھ ساتھ فیض احمد فیض کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مروجہ خاموشی کے تسلسل کو توڑتے ہوئے بعض اوقات اپنی نظم کا آغاز تو رومانوی انداز میں کرتے ہیں لیکن جلد ہی اسے انقلاب کی طرف موڑ لیتے ہیں اور اسے مظلوم اور بے آواز طبقے کا آواز بنا دیتے ہیں اور نظم کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس میں مروجہ کلچر آف سائلنس اور Social Silencing کے تسلسل پر کاری ضرب لگاتے ہیں. اسی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عزیزہ بانو کہتی ہیں:

فیض کی ابتدائی شاعری کی یہ بڑی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اکثر اپنی نظموں کا آغاز رومانوی انداز میں کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ اس رومانی بھنور سے نکل کر فکر و خیال کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور نظم اچانک موڑ لے لیتی ہے اور وہ محبوب کے رخسار، آنچل، جیاؤں اور اپنی وفاؤں کا ذکر کرتے کرتے عوام کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ جہاں وہ محبوب سے مخاطب ہو کر اس کو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش رہنے والے لوگ نہ صرف یہ کہ بہت غریب ہیں بلکہ ان کی غریبی اور بے چارگی میں بہت کشش ہے۔ وہ سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ کے لوگوں کے ظلم کے شکار ہیں۔[23]

فیض کی شاعری کے تناظر میں ظلم اور سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھانے اور خاموشی توڑنے کے تدریجی مدارج میں ایک درجہ دلیرانہ للکار اور جوش و جلال کا بھی ہے اس حوالے سے سید سبط حسن صاحب اپنی کتاب سخن در سخن میں رقم طراز ہیں:

فیض صاحب بڑے صلح پسند اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کا لہجہ عموماً بہت نرم ہوتا تھا حتیٰ کہ ان کی للکار کی لے بھی بہت مدھم ہوتی تھی۔ وہ جلالی نہیں بلکہ جمالی شاعر تھے مگر ان کی نظم 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے "نقش فریادی' کی طرز فغاں سے بالکل جدا ہے اور ان کے مزاج سے بالکل مختلف۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی رجزیہ نظم فیض صاحب کے قلم سے پھر کبھی نہ نکلی۔ موضوع کی رعایت سے مختصر بحر کا انتخاب، لفظوں کی کفایت، جذبات کا جوش و جلال اور دلیرانہ للکار۔[24]

فیض کی شاعری کے متعلق ناقدین کی آراء کا یہ تنوع اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مختلف ناقدین نے سپائرل آف سائلنس کو توڑنے کے ان تدریجی مراحل میں سے کسی مخصوص پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی شاعری پر اپنے تنقیدی آرا دیے ہیں کیونکہ ناقدین کے ان متنوع آراء کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں بھی فیض کی شاعری میں سپائرل آف سائلنس کو توڑنے کے مختلف پہلوؤں اور مدارج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اگرچہ یہ آرا پہلے سے موجود تھے لیکن اس مقالے کے ذریعے ان آراء کو سپائرل آف سائلنس نظریے کے ساتھ جوڑ کر ان کی تفہیم نو کی گئی۔ یہ مقالہ وٹگنسٹائن کے کتاب Tractatus logico-philosophicus کے آخری الفاظ پر ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ الفاظ عرصہ دراز سے خاموشی کے بارے میں محققین کی توجہ کا باعث رہے ہیں:

What we cannot speak about we must pass over in silence.[25]

حوالہ جات

1. Scheufele, D. A. (2008). Spiral of silence theory. In W. Donsbach & M. W. Traugott (Eds.), The SAGE handbook of public opinion research (pp.175-83). London: SAGE Publications. Page.175

2. Communication Theories, Page.144, University of Twente

pdf is available for download on: http://www.utwente.nl/communication-theories

Site visited at: 09:35 pm, 23 april 2022

یہ کتاب ٹونٹی یونیورسٹی نے طلباء کے نصابی ضروریات کے تحت مرتب کی ہے اس لئے اس پر مصنف کا نام نہیں ہے۔

3. Ibid, page.144

4. فاطمی، علی احمد، پروفیسر، فیض ایک نیا مطالعہ، شارپ ٹریک الہ آباد، طبع اول، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

5. فیض، احمد فیض، مہ وسال آشنائی، احمد برادز کراچی، طبع چہارم، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱، ۱۲

6. Sherman Wilcox, Breaking through the culture of silence

Source: Sign Language Studies , Summer 1987, No. 55 (Summer 1987), pp. 163-174, Gallaudet University Press

Available at URL:https://www.jstor.org/stable/26203984

URL visired at: 03:27 pm, 25 march 2022

7. Twenty-five years of the spiral of silence: A conceptual review and empirical outlook, march 2000, International Journal of Public Opinion Research 12(1)

DOI:10.1093/ijpor/12.1.3

Authors:

•Dietram A. Scheufele; University of Wisconsin–Madison

•Patricia Moy; University of Washington

Available at https://www.researchgate.net/publication/31126568_Twenty-five_years_of_the_spiral_of_silence_A_conceptual_review_and_empirical_outlook

Site visited at: 02:47 pm, 25 march 2022

8. فیض، احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں لاہور، طبع دھم، ۱۹۶۸ء، ص ۸۸

9. ایضاً نقش فریادی، ص ۷۹

10. ایضاً نقش فریادی، ص ۹۲

11. بانو، عزیزہ، ڈاکٹر، فیض کی شاعری میں اشتراکی رجحانات، جنوری ۲۰۰۹ء، سرسوتی پریس، الہ آباد، انڈیا، ص ۱۸۸

12. فیض، احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں لاہور، طبع دھم، ۱۹۶۸ء، ص ۹۴

13. Culture of social silencing is a phenomenon where people who think they hold a minority opinion Don't speak of the fear of social execution. It is something closely related with the 'Spiral of Silence Theory'.

14. فیض، احمد فیض، نقش فریادی، اردو گھر، کوچہ فواد خان، دہلی، طبع سوم، ۱۹۴۱ء، ص ۹۲

15. ایضاً نقش فریادی، ص ۹۵

16. ترقی پسند ادب، دستاویزات، کراچی۔ ۱۹۳۶۔۱۹۸۶ء، ص ۵۰، ۵۱، بحوالہ ڈاکٹر عزیزہ بانو

17. فیض، احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں لاہور، طبع دھم، ۱۹۶۸ء، ص ۸۶

18. فیض، احمد فیض، دست صبا؛ مشمولہ نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں لاہور، سن طباعت ندارد، ص ۱۰۷

19. فیض، احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں لاہور، طبع دھم، ۱۹۶۸ء، ص ۷۲

20. فیض، احمد فیض، دست تہ سنگ؛ مشمولہ نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں لاہور، سن طباعت ندارد، ص ۳۰۶، ۳۰۵

21. عرفان الحسن، فیض کی شاعری میں استعارہ سازی رومانویت اور اشتراکیت کے پس منظر میں، مقالہ برائے ایم فل اردو، شعبہ اردو، اسکول آف لینگویجز، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، ۲۰۱۹ء، ص ۸۷

22. شکیب، ضیاء الدین احمد، محمد، فیض کی مزاحمتی شاعری کا آغاز اور ارتقاء، مشمولہ؛ سہ ماہی تحقیقی مجلہ، نوائے ادب، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ج ۶۱ شمارہ ۳-۴، اکتوبر ۲۰۱۱ء تا مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۴

23. بانو، عزیزہ، ڈاکٹر، فیض کی شاعری میں اشتراکی رجحانات، جنوری ۲۰۰۹ء، سرسوتی پریس، الہ آباد، انڈیا، ص ۱۸۸

24. حسن، سبط۔ سخن در سخن، مکتبہ دانیال، کراچی، طبع اول، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷، ۱۶

25. Wittgenstein, Ludwig (2018): Tractatus Logico-Philosophicus. Logisch-philosophische Abhandlung. Side-by-side-by-side edition, Version 0.54 (February 5,2018),
containing the original German, alongside both the Ogden/Ramsey, and Pears/McGuinness English translations. With an introduction by Bertrand Russell. [http://people.umass.edu/klement/tlp/ , 02.07.2022] [1922]